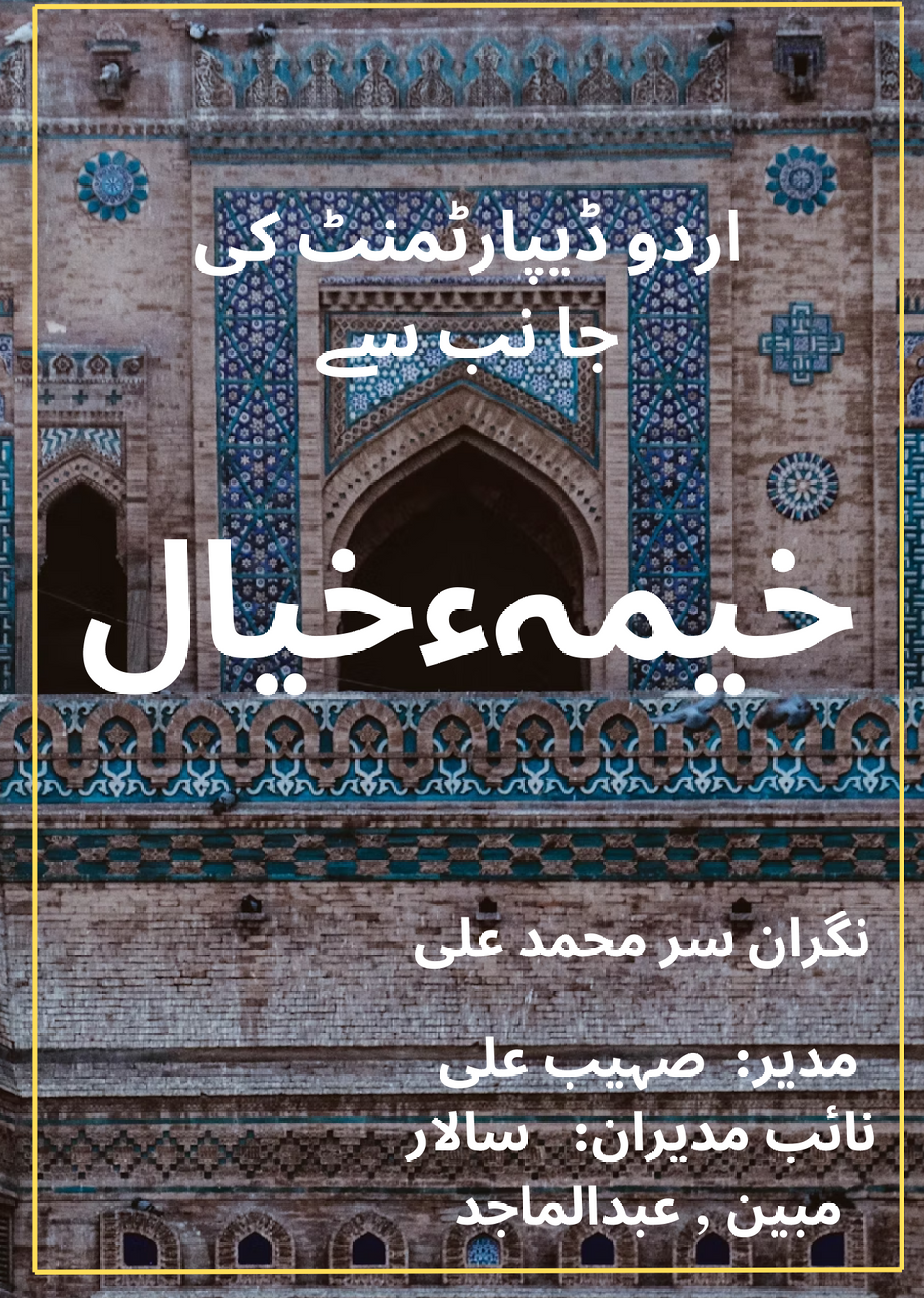

اردو ڈیپارٹمنٹ کی
جانب سے

خیمۂ خیال

نگران سر محمد علی

مدیر: صہیب علی
نائب مدیران: سالار
مبین , عبدالماجد

رات کا سفر
(مختصر کہانی)
احید عفان بخشی، کلاس سی ٹو جی

رات دفتر سے تاخیر سے فارغ ہونے کی وجہ سے احمد بہت تھکا ہوا تھا اور گاڑی تک جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رات دفتر میں ہی گزار لے کہ اس کی بیوی کا فون آگیا۔

کہاں رہ گئے ہیں آپ؟ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔

ہاں بس آج دفتر میں کام بہت تھا تو دیر ہوگئی۔ کیوں خیریت ہے ناں؟

نہیں! مجھے فاطمہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ کیا آپ جلدی گھر آ سکتے ہیں؟

یہ سن کر احمد کو تھکاوٹ بھول گئی اور وہ فوراً کرسی سے اٹھا اور دفتر سے باہر بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف لپکا۔ احمد کو اپنی بیٹی فاطمہ کی اتنی فکر ہو رہی تھی کہ اسے سڑک کہ عین بیچ Body بڑا سا گڑھا نظر ہی نہیں آیا اور اس کی گاڑی کا ٹائر گڑھے میں کسی نوکیلی شے کے ساتھ ٹکرا کر پھٹ گیا۔ گاڑی بےقابو ہو کر پوری سڑک پر گھومنےلگی، اور دو تین دفعہ چکر لگانے کے بعد آخر کارایک کھائی میں گر کر ساکت ہو گئی۔ اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے احمد کا سر سٹیرنگ ویل میں جا لگا اور وہ وہیں بیہوش ہو گیا۔

اب جب احمد کی آنکھ کھلی تو وہ گاڑی کی بجائے ایک سفید اور چمکدار کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی ،عقب سے ایک آواز سنائی دی،

سنبھل کے احمد صاحب! آپکو کافی گھرے زخم لگے ہیں، کہیں وہ مزید بگڑنہ جائیں۔

احمد کی نظروں نے آواز کا تعاقب کیا تو پتا چلا کہ وہ تو ایک ڈاکٹر کی آواز ہے۔

معافی چاہتا ہوں احمد صاحب! مگر آپکو کچھ دیر کے لیے بےہوش کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

یہ سن کر احمد کو اپنے بازو میں ہلکا سا درد محسوس ہوااور وہ ایک دفعہ پھرغنودگی میں چلا گیا۔ دوسری بار جب احمد کی آنکھ کھلی تو وہ اسی کمرے میں تھا مگر اس کا پورا خاندان اس کے گرد کھڑا ہوا تھا۔

میں کہاں ہوں؟ احمد نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

سب نے اس کی آواز سن کر آبدیدہ ہو کر اپنی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

آپ نیشنل ہسپتال میں ہیں احمد! واپس آتے ہوئے آپ کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، وہ تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایک اللہ کے نیک بندے نے آپ کی گاڑی کو دیکھ لیا اور آپ کو یہاں لے آیا۔ احمد کی بیوی نے روتے ہوا سارا ماجرابیان کیا۔

فاطمہ کہاں ہے؟ احمد نے پوچھا۔

فاطمہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ اتنے فکرمند ہو جائیں گے تو آپ کو کبھی نہ بتاتی!

نہیں مجھے اسے ملنا ہے۔ کہاں ہے وہ؟

میں ادھر ہوں بابا! فاطمہ پیچھے سےدوڑی آئی اور اپنے بابا سے جا کر چپک گئی۔

آپ ٹھیک ہو ناں بیٹی؟

جی! میں بالکل ٹھیک ہوں بابا! بس اب آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں کیونکہ ابھی آپ نے میرا سالگرہ کا تحفہ بھی دینا ہے۔

ہاں !ضرور بیٹی ضرور۔

ابھی باپ اور بیٹی ایک دوسرے سے اچھی طرح مل ہی رہے تھے کہ پیچھے سے ایک نرس آئی اور سب کو باہر لے گئی کیونکہ اب احمد کے آرام کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ نرس نے احمد کو نیند کی گولیاں دیں اور وہ پلک جھپکتے ہی میٹھی نیند سو گیا۔

سقراط

ایک زمانے میں قدیم ایتھنز میں سقراط اپنی حکمت اور سچائی کی تلاش کے عزم کے لیے جانا جاتا تھا۔ ایک دن ایک نوجوان اس کے پاس آیا اور پوچھا سقراط، علم کا راز کیا ہے؟ سقراط نے مسکرا کر جواب دیا، "میرے دوست، میرے پیچھے چلو۔" وہ نوجوان کو قریبی ندی کی طرف لے گیا اور کہا کہ آؤ مل کر پانی میں چلتے ہیں۔ نوجوان نے ہچکچاہٹ کی لیکن سقراط کی پیروی کی۔ جیسے ہی وہ دریا کی گہرائی میں جا رہے تھے، سقراط نے اچانک نوجوان کا سر پکڑ لیا اور اسے پانی کے اندر دھکیل دیا۔ نوجوان نے جدوجہد کی اور ہوا کے لیے ہانپیں، شدت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بالآخر سقراط نے اسے رہا کر دیا۔ کھانستے اور سانس لینے کے لیے ہانپتے ہوئے نوجوان نے غصے سے پوچھا، "تم نے ایسا کیوں کیا؟" سقراط نے اطمینان سے جواب دیا، "جب آپ پانی کے اندر تھے، آپ کو سب سے زیادہ کیا خواہش تھی؟" نوجوان نے جواب دیا، "ہوا! مجھے ہر چیز سے زیادہ ہوا چاہیے۔" سقراط نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا، "میرے دوست، علم کا راز یہی ہے۔ جس طرح تم نے غرق ہونے کے وقت ہوا کو ترسایا تھا، تمہیں اسی شدت سے علم کی تمنا کرنی چاہیے۔ تب ہی تمہیں صحیح معنوں میں حکمت کی تلاش ہوگی۔" یہ کہانی سقراط کے اس عقیدے کو واضح کرتی ہے کہ حقیقی علم سیکھنے اور سمجھنے کی گہری خواہش سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ علم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے غیر فعال طریقے سے حاصل کیا جائے، بلکہ ایک ایسی چیز ہے جسے ہمیں جذبے اور عزم کے ساتھ فعال طور پر حاصل کرنا چاہیے۔

قومیں ناکام کیوں ہوتی ہیں، ایک مختصر تبصرہ
صہیب علی، ایف ایس سی پارٹ ون

ْقومیں ناکام کیوں ہوتی ہیں؟ٗ ایک دلچسپ کتاب ہےجس میں قوموں کی کامیابی یا ناکامی کے پیچھےکارفرما عوامل کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنفین (Daron Acemoglu)اور (James A. Robinson) دلیل دیتے ہیں کہ کسی ملک کی خوشحالی کی کنجی اس کے سیاسی اور معاشی اداروں میں مضمر ہے۔ کتاب کے مطابق جامعاور مضبوط سیاسی اور معاشی ادارے کسی بھی قوم کی کامیابی کے لیےنہایت اہم ہوتے ہیں۔ یہ ادارے مساوی حقوق کو فروغ دیتے ہیں، جدید اختراعات اور نت نئی ایجادات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اور تمام شہریوں کو معیشت میں حصہ لینے کے یکساں مواقع فراہم کرتے ہیں۔اداروں میں قانون کی حکمرانی ، لوگوں کے لیے مساوی حقوق اور ترقی کے یکساں مواقع کی فراہمی وہ مرکزی عناصر ہیں جو ایک قوم کو ترقی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ ادارے کہ جہاں عدل و انصاف نام کو نہیں ہوتا رفتہ رفتہ پوری قوم کو تباہی کے دہانے پہ لا کھڑا کرتے ہیں۔ ایسےتباہ کن ادارے طاقت اور دولت کو چند لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز کر دیتے ہیں، جس سے عدم مساوات، بدعنوانی اور محدود اقتصادی مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ ان اداروں میں اکثر قانون کی حکمرانی کا فقدان ہوتا ہے اور وہ انسانی حقوق کے تحفظ میں ناکام رہتے ہیں۔ مصنفین اپنے دلائل کی تائید کے لیے تاریخی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ انگلینڈ، متحدہ عرب امارات اور جنوبی کوریا جیسی اقوام جنہوں نے سیاسی اور معاشی اعتبار سے معتدل ادارے تیار کیے آج ترقی اور عروج کی منازل طے کر رہی ہیں۔مصنفین نے اس کتاب میں شمالی کوریا اور بہت سی دوسری اقوام کا بھی جائزہ لیا ہے جہاں بدعنوانی پہ قائم اداروں نے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور غربت کو فروغ دیا۔ مجموعی طور پر،ْقومیں ناکام کیوں ہوتی ہیںٗ ایک فکر انگیز کتاب ہے جو قوموں کی تقدیر کی تشکیل کرنے والے اہم عناصر کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اگر آپ کسی قوم کی کامیابی یا ناکامی کے پیچھے عوامل کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے۔

ایک یادگار سفر

عبدالماجد، کلاس سی ون جی

جیسے ہی سکول سے چھٹیاں ہوئیں ہم دوستوں نے وادیء کیلاش جانے کا اِرادہ بنایا۔ دو چار دنوں کے بعد ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے ۔ ایک رات اسلام آباد قیام کر کے ہم آگے کی طرف گامزن ہوئے ۔ ناران پہنچنے سے پہلے ہی ہماری ایک گاڑی خراب ہو گئی۔ دوسری گاڑی میں موجود ہمارے دوستوں نے اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے ۔ مزید کوشش کرنے کے بعد پتا چلا کہ گاڑی کا آئل فلٹر خراب ہو گیا ہے ۔ مقامی لوگوں کے تعاون سے ہمیں جلد ہی نیا فلٹر مل گیا ۔ ہمارے ایک دوست نے اسے گاڑی میں لگایا اور یوں ہمارا مسئلہ حل ہوگیا ۔ سبھی نے سکھ کا سانس لیا اور اپنا سفر جاری رکھا ۔ کچھ ہی گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہم اپنی منزِل مقصود پر پہنچ گئے ۔

ہم نے اس شہر میں بےشمار حسین مناظر دیکھے ۔ خوبصورت اونچے پہاڑ ، دلکش سرسبز وادیاں ، گھنے جنگلات ، بہتے دریا اور جنگلوں میں موجود خوبصورت جنگلی جانور ہمیں اپنی طرف مائل کر رہے تھے ۔ برف سے ڈھکے پہاڑ بھی ہماری توجہ کا مرکز رہے ۔ سڑک کنارے لگے مختلف پھلوں کے درختوں نے ہمیں وہاں رکنے پر مجبور کر دیا ۔ ان کا منفرد ذائقہ ہمارے کام و دہن کو سرور بخشرہا تھا ۔ بلند و بالا آبشار اُس علاقے کی خوبصورتی کو چارچاند لگا رہے تھے ۔ وہاں پر موجود مختلف رنگوں کی ٹھنڈے پانی سے بھری جھیلوں نے ہمیں اپنا مداح بنا لیا ۔

جب ہم وادیء کیلاش میں گھوم رہے تھے تو ہمارے دوست علی کی اپنے ایک دیرینہ ساتھی سے ملاقات ہو گئی ۔ یہ صاحب وہاں کے مقامی تھے ۔ اچانک ملاقات پر وہ بےحد خوش ہوئے ۔ انہوں نے علی سے ان کے گھر جانے کا اصرار کیا جس پر وہ انکار تو نہ کر سکا، البتہ قدرے لجاتے ہوئے عرض کی،ؔ جناب! میں تو اپنے دوستوں کے ہمراہ ہوں ، میں ان کو چھوڑ کر کیونکر آ سکتا ہوں؟ؑ اس پر وہ بھلے صاحب کمال مروت سے گویا ہوئے،ؔ آپ سبھی آج ہمارے مہمان ہیں!ؑ قصہ مختصر! وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے ۔ گھر پہنچتے ہی سب گھر والے جمع ہو گئے اور ہمارا پر تپاک استقبال کیا ۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعدہم تازہ دم ہوئے تو وہ ہمارے لیے اپنے علاقے کا خاص شربت لے آئے ۔ شربت پیتے ہی ہماری ساری تھکاوٹ اتر گئی ۔ جب سورج ڈھل گیا اور رات ہو گئی تو دسترخوان پر کھانا چن دیا گیا ۔ خوانِ نعمت تھا کہ من و سلویٰ، کیا بتائیں! طرح طرح کے لذیذ پکوان تھے جن میں ان کا روایتی مٹن دم پخت ، روش ، ٹراؤٹ مچھلی اور ان کا خصوصی پُلاو ٹھا بھی شامل تھا ۔ کھانے کے ہر لقمے میں ان کی محبت شامل تھی ۔ کھانے کے بعد وہ ہمارے لیے اپنے باغات سے تازہ آڑو توڑ لائے ۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں اپنا روایتی قہوہ پیش کیا ۔ اس کے بعد ہم سو گئے اور صبح ہوتے ہی ان سے اجازت لے کر واپس روانہ ہوگئے۔ یہ ہم سب کے لیے ایک یادگار سفر تھا۔

تعلیم و تربیت اور ہمارا رویہ

عالیان شاہد، کلاس سی ٹو جی

بچپن سے ہی گھر پہ رسالہ تعلیم و تربیت آیا کرتا تھا ۔ پھر اردو کی نصابی کتابوں میں بھی تعلیم و تربیتؑ کے الفاظ کو ساتھ ساتھ پڑھا۔ لغت ،مفہوم یا فلسفیانہ بحث سے قطع نظر زندگی کے سادہ سے تجربات اور مشاہدات سے میں نے سیکھا کہ تعلیم اور تربیت کا زندگی کے ابتدائی ادوار میں ترتیب کے لحاظ سے برعکس تعلق ہے ۔ یعنی زندگی میں پہلے تربیت کا دخل ہے اور تعلیم بعد کےارتقائی مراحل کا سلسلہ ہے ۔حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ تربیت سکھائی جاتی ہے یا اس کا وراثت سے کوئی واسطہ بھی ہے؟

غسل خانے کا دروازہ کھول کر کر زور زور سے ناک صاف کرنا، عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالتے ہوئے گلا صاف کرنا، پوری قوت سے ناک اور گلے کو کھنگالتے ہوئے مغلظات کو اس طرح نکالنا گویا گھر کے دوسرے کونے میں سننے والے کو تشویش لاحق ہو جائے کہ اس کے ساتھ ساتھ دماغ بھی ناک یاگلے کے ذریعے باہر نہ آ جائے،اس کا تعلق تعلیم سے زیادہ تربیت سے ہے۔یہاں میں وراثت کا نقطہ بھی واضح کر دوں۔باپ ستر سال سے اسی مشق میں غلطاں تھا کہ بیٹے نے بھی پچھلے بیس برس سے اس روایت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ سچ پوچھیں تومجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس کا اس کارروائی میں دماغ کا کچھ نا کچھ حصہ تو گٹر کی نذر ہو ہی گیا ہوگا ۔ورنہ اتنا ہی خیال آ جاتا کہ یہ شوق غسل خانے کا دروازہ بند کر کے بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔

چلیے کھانے کی میز پر چلتے ہیں۔کھانا میز پر لگانے کا طریقہ ایک لمبی داستان کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا .اس لیے براہ راست کھانا کھانے کی طرف غور کرتے ہیں ۔میز کے ایک طرف بیٹھ کر میز پر تقریباً لیٹتےہوئے دوسرے کونے سے گلاس پکڑنا بھی گویا ایک فن ہے ۔ جب کوئی سالن کا ڈونگا پکڑانے کو کہے تو اس کو پیش کرنے سے پہلے فوراً اپنی پلیٹ میں بہترین بوٹی نکال کے ڈالیں اور پھر وہ سالن دوسرے کے حوالے کردیں۔پلیٹ میں چاول کا ایک ڈھیر لگائیں پھر اس پر حسب توفیق سالن کی تہ انڈیل لیں اور آخر میں سلاد کا مینار سجانے کے بعد جتنا کھایا جائے کھا لیں باقی تبرک کے طور پر چھوڑ دیں۔20 پلیٹیں رکھی ہونے کے باوجود ہڈیاں میز پر رکھتے جائیں ،لسی گا جگ بالکل اپنے سامنے رکھیں اور اپنے گلاس میں لسی ختم نہ ہونے دیں چاہے دوسرے کو ملے یا نہ ملےآپ کی بلا سے۔ آخر میں شوربے اور گھی سے لتھڑے ہوئے ہاتھ روٹی کے رومال سے صاف کریں اور اگر ضرورت پڑےتو اس سے منہ بھی پونچھ لیں ۔اس سے پہلے کہ میرے قلم کو ابکائی آ جائے آئیے ہم کھانے کی میز سے اٹھ جاتے ہیں۔

کھانے کے بعد ایک تیلی لیں اور خلال شروع کردیں ۔دانتوں سے ذرات نکالیں اور تھوتھو کر کے ہوا میں اڑانا شروع کر دیں۔ ساتھ ہی تیکھا مصالحہ ہونے کے باعث اگر ناک پونچھنا ضروری ہو تو پاس کے تولیے یا بستر کی چادر کے کونے سے صاف کرلیں۔ کچھ بھی نہ ملے تو گزرتے گزرتے ہاتھ سے ناک صاف کرکے دیوار سے پونچھ لیں ۔

گھر کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ پورے گھر کی جھاڑ پونچھ کرکے اسی کپڑے سے چہرے کا پسینہ پونچھ لیں ۔ صفائی کا کپڑا چھوڑ کر اگلا کام شروع کر دیں ۔ تمام برتن اچھی طرح مانجھ کر اسی برتن دھونے والےسکوچ برائٹ سے کوڑا دان بھی مانجھ لیں اور جس جگہ برتن دھوئے ہیں وہاں کوڑا دان مانجھنے کے بعد کولی کرلیں، گلا صاف کریں ،تھو کیں اور منہ ہاتھ دھو لیں۔

مندرجہ بالا تمام تذکرے میں تعلیم کا کہاں ذکر ہے؟ میٹرک سے پی ایچ ڈی تک کسی نصاب میں ایسا کچھ نہیں پڑھایا جاتا ۔ اس پوری تحریر میں جو بھی بیان کیا گیا وہ گریجوایشن یا سولہ جماعت تک پڑھے لکھے لوگوں کی زندگی کا عمومی رویہ تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ تربیت سکھائی نہیں جاتی بلکہ عمل سے بتدریج اگلی نسل میں منتقل کی جاتی ہے ۔تربیت یافتہ شخص تعلیم یافتہ شخص سے کہیں بہتر ہے کیونکہ آج کل تو تعلیمی ڈگریاں اصل میں تعلیمی اخراجات کی رسیدیں ہیں۔